انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ - شمارہ ۱۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء

آل احمد سرور

میر عثمان علی خاں

مجھے والیانِ ریاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انگریز کے دور میں دیسی ریاستوں کو میں جاگیرداری کے نظام کا آخری قلعہ کہا کرتا تھا۔ حیدرآباد، بھوپال، رام پور سب ریاستوں کی شان و شوکت دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے، مگر اس ساری شان و شوکت کو میں نے کبھی ایک تماشے سے زیادہ حیثیت نہ دی۔ اس لیے نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کی وفات کی خبر سن کر مجھے جو رنج و افسوس ہوا وہ اس وجہ سے نہیں کہ آصف جاہی سلسلے کے ساتویں فرمانروا اس دنیا سے رخصت ہو گئے، بلکہ ان کے ساتھ کچھ ایسی روایات وابستہ تھیں جو مجھے عزیز ہیں، جو میرے نزدیک ہندوستان کی مشترک تہذیب کی خصوصیت ہیں اور جن کے ساتھ میر عثمان علی خاں آصف سابع کا نام بھی ضرور زبان پر آتا ہے۔

مجھے ۱۹۴۸ء کا لکھنؤ یاد آتا ہے۔ سروجنی نائیڈو یو۔پی کی گورنر ہیں۔ کیسی گورنر جو اپنے ملٹری سکریٹری کو جو سرکاری کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے کھڑا ہوا ہے، یہ کہہ کر رخصت کر دیتی ہیں کہ جاؤ، اس وقت میں شعر و ادب کی باتیں کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر وی۔ ایس۔ رام صدر شعبۂ سیاسیات کے یہاں موسیقی کی ایک محفل ہے۔ مسز نائیڈو بھی موجود ہیں۔ اچانک ملٹری سکریٹری خوش خوش داخل ہوتا ہے اور گورنر سے کہتا ہے۔ مبارک ہو، حیدرآباد فتح ہو گیا۔ مگر یہ کیا۔ گورنر یہ خبرِ فرحت اثر سننے پر خوش ہونے کے بجائے زار و قطار رونے لگتی ہیں۔ لوگ حیران ہو کر ان سے پوچھتے ہیں کہ خوشی کے موقع پر یہ رونا کیسا۔ وہ کہتی ہیں کہ خوشی اپنی جگہ پر، مگر میں اس لیے رو رہی ہوں کہ میرے بادشاہ کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ یہ کیسا بادشاہ تھا جس کی محبت ہندوستان کی آزادی کی اس سپاہی کے دل میں اس جوش و خروش سے موجزن تھی۔

مجھے ۱۹۴۴ء کا حیدرآباد یاد آتا ہے۔ اردو کانفرنس کا اجلاس ہو رہا ہے۔ باہر سے جو ادیب اور شاعر آئے ہیں، وہ ایک محل میں ٹھیرائے گئے ہیں، ان کے قیام و طعام کا انتظام ایسا شاہانہ انداز کا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اردو کے ادیب اور شاعر جنھیں کوئی نہیں پوچھتا، یہاں آنکھوں پر بٹھائے جا رہے ہیں۔ کانفرنس کے جلسوں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ پہنچتے ہیں اور صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں۔ کتابوں کی نمائش دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں کتنا گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ سڑکوں کے نام اردو میں ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں ہندو اور مسلم فنونِ تعمیر کا کیسا حسین امتزاج ہے۔ سالار جنگ کے عجائب خانے میں کیسے نوادر ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ میں مخطوطات کا کیسا شاندار ذخیرہ ہے۔ حیدرآباد کی سڑکیں کتنی کشادہ ہیں۔ وہاں کی مصنوعات کو کیسی ترقی ہوئی ہے۔ وہاں آب پاشی اور بجلی کے لیے کیسے بڑے ذخیرے بنائے گئے ہیں۔ ان سب باتوں کے پیچھے کس کا ذہن، کس کی علم دوستی اور ادب نوازی، کس کی دور بینی اور کس کی حکمتِ عملی ہے۔

۱۹۳۶ء کا علی گڑھ یاد آتا ہے۔ نظام حیدرآباد کے استقبال کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ لٹن لائبریری میں جمع ہوئے ہیں۔ دستار باندھے اور بکلوس لگائے حیدرآباد کے شاہزادے اور امرا دروازے کے قریب استادہ ہیں۔ یہ اعظم جاہ ہیں، یہ معظم جاہ ہیں، یہ سر اکبر حیدری ہیں۔ صورت سے بالکل گھگھو معلوم ہوتے ہیں مگر بڑے بیدار مغز اور روشن خیال سمجھے جاتے ہیں۔ لیجیے یہ نظام حیدرآباد داخل ہوئے۔ دبلے، پتلے، سیاہ فام، گال پچکے ہوئے، دستار میلی، پتلون معلوم ہوتا ہے گھڑے میں سے نکلی ہے۔ کچھ دیر سر اکبر حیدری سے بات کی۔ پھر ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر کے ساتھ کمرے کا ایک چکر لگایا۔ ہاتھ کسی سے نہیں ملایا۔ پھر جلوس چلا۔ اسٹریچی ہال میں ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ انھوں نے رسمی سا جواب دیا۔ پھر لارڈ ولنگڈن آئے۔ تقریر کے بعد فوراً اسپیشل گاڑی سے واپس گئے۔ نظام کے اعزاز میں لنچ ہوا۔ لنچ کے بعد وہ حبیب منزل گئے۔ وہاں نذر وصول کی مگر علی گڑھ کو بہت کچھ دے گئے۔

میر عثمان علی خاں کی سادگی، کفایت شعاری بلکہ جز رسی کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ خدا جانے کتنے سچ ہیں کتنے یاروں کی افسانہ طرازی

کے کرتے ہیں، مگر ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کی مثالیں ایسی روشن اور اتنی بے شمار ہیں کہ علم کا کوئی پرستار، اور ادب کا کوئی فدائی انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اردو کے تو وہ بہت بڑے محسن تھے۔ حیدرآباد میں اردو نہ صرف سرکاری زبان تھی، نہ صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی بلکہ جامعہ عثمانیہ نے اعلیٰ تعلیم اردو میں دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ایک جدید ہندوستانی زبان کے ذریعے جدید علوم کے بلند ترین معیار تک درس و تدریس اور تحقیق و تدقیق کے فرائض انجام دیے جا سکتے ہیں۔ تمام منصف مزاج ماہرینِ تعلیم نے جامعہ عثمانیہ کے معیار پر اطمینان ظاہر کیا۔ دارالترجمے کے ذریعے سے سیکڑوں معیاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا اور اگر وحید الدین سلیم کے نقطۂ نظر کو اپنایا جاتا اور نظم طباطبائی اور مرزا ہادی رسوا کی رائے کو اتنی اہمیت نہ دی جاتی تو دارالترجمہ کی وضع کی ہوئی اصطلاحات اب بھی کام میں آتیں۔ پھر بھی ان سے آج بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام اور دارالترجمہ کا پروگرام دونوں میر عثمان علی خاں کی دوربینی، فیاضی اور علم دوستی کی ایسی مثالیں ہیں جنھیں ہندوستان کی علمی و ادبی تاریخ میں ہمیشہ ایک ممتاز مقام حاصل رہے گا۔

دولت و حکومت آنی جانی چیزیں ہیں، علم باقی رہتا ہے، ادب زندہ رہتا ہے۔ ادب کی تخلیق کرنے والا بھی اور اس تخلیق کے لیے فضا پیدا کرنے والا اور اس کی ہمت افزائی کرنے والا بھی۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی ۔ ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

ٹورنٹو سے اردو جریدہ صہبا کا اجراء

ٹورنٹو (کنیڈا)۔ نگار کے دیرینہ رفیق پروفیسر ضیا علیگ نے جو لارنشین یونیورسٹی سڈبری، انٹوریو، کنیڈا میں تاریخ کے پروفیسر ہیں اطلاع دی ہے کہ ٹورنٹو کے اردو داں اور باذوق حضرات اپنی بزم ادب کے زیر اہتمام "صہبا" (یہ نام پروفیسر ضیا نے تجویز کیا ہے) ایک اردو جریدہ جاری کر رہے ہیں اس کی ادارت کے فرائض اے۔ ایچ۔ کے قریشی کے سپرد ہیں۔ صہبا کے اجراء کا مقصد یہ ہے کہ مغرب اور مشرق میں رابطہ قائم ہو اور اہل مشرق کو مغربی ادب کلچر اور بالخصوص شمالی امریکہ کی ادبی و ثقافتی تحریکوں اور سرگرمیوں سے باخبر رکھا جائے۔ شمالی امریکہ کی تاریخ میں یہ پہلا اردو جریدہ ہے جسے اردو سے محبت رکھنے والے ٹورنٹو جیسے دور افتادہ مقام سے شائع کرنے کی ابتدا کر رہے ہیں۔ (نگار)

روسی ادیبوں کو اعلیٰ ترین اعزازات

ماسکو۔ سوویت یونین کا اعلیٰ ترین اعزاز "ہیرو آف سوشلسٹ لیبر" میخائل شولوخوف، کونسٹنٹائن فیدین، الیگزنڈر کورنی چک، لیونڈ لیونانی، مرزا ترسون زادہ، پاوستوشانا اور آندرے ایپٹ کو گزشتہ دنوں دیا گیا۔ ان ادیبوں میں سے اکثر لینن انعام یافتہ ہیں اور مائیکل شولوخوف کو نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔ (نگار)

ایک عجیب اردو لغت

بھودان تحریک کے ایڈیٹر اسد فاطمی ونوبا جی سے اپنی ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں جا کر اچیت بھائی کے پاس جا بیٹھا جو کسی مسودے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

اچیت بھائی کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ خوش ہو کر بولے بابا کی اردو لغت کا مسودہ ہے، اور قبل اس کے کہ اس مسودے کے دستیاب ہو جانے میں اپنی خوشی کا اظہار کروں کچھ الفاظ و معنی پر انھوں نے مجھ سے گفتگو شروع کر دی۔ الفاظ و معنی پر ابھی ہم گفتگو کر رہے تھے کہ ونوبا جی غسل خانے سے باہر نکلے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے یہ لغت اپنے لیے تیار کیا تھا ہم نے اردو تو سیکھی نہیں تھی عربی سیکھی تھی، لیکن سمجھنے کے لیے جیل میں (انجمن حمایت اسلام لاہور) کی اردو کی چار کتابیں پڑھیں، لیکن جب میں پد یاترا میں نکلا تو اردو الفاظ بولنے لگا، اردو کے جو شبد صحیح میری زبان پر آجاتے تھے انھیں میں بولتا تھا، پھر ان الفاظ کو میں نے لکھ لیا اور "میاں" (انتخاب قرآن کے زمانے میں، اچیت بھائی کی لگن اور تحقیق و جستجو کے جذبے کو دیکھ کر ونوبا جی کہتے تھے کہ ہندوؤں میں ایک مسلمان مجھے ملا ہے اور تب سے اچیت بھائی کا نام ونوبا جی نے "میاں" رکھ دیا ہے) بتایا ہے کہ تین ہزار الفاظ اس لغت میں آگئے ہیں۔"

یہ لغت جو بالکل استعمالی الفاظ کی بنا پر تیار ہوئی ہے اس لحاظ سے یقیناً بہت اچھی ہوگی کہ وہ اردو کے رواں الفاظ کو ایک جگہ پر دے دے گی جو بالکل بنیادی ہیں اور جن کے جان لینے سے روزمرہ کا کام چل سکتا ہے اور یقینی یہ لغت ایک طرح کی بیسک اردو ہوگی۔ اردو ادب میں ہم اس اضافہ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ (قومی آواز)

اردو کے نوجوان شاعروں کا کلام ریڈیو سے نشر کرنے کی تجویز

نئی دہلی۔ یہاں وزیر اطلاعات و نشریات راج بہادر کی صدارت میں ہونے والی آل انڈیا ریڈیو کی اردو مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ نے تجویز پیش کی ہے کہ ہر ہفتہ اس کے پروگراموں میں اردو کے نوجوان شاعروں کا کلام مناسب عنوان سے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح سے نئے فن کاروں کی دریافت ہو سکے گی۔ (سیاست جدید)

جموں کے ڈوگری شاعری کا مجموعہ کلام چھاپا جائیگا

جموں۔ جموں کے مشہور شاعر ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ سامیال جنھیں انتقال کیے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں ان کی تخلیقات کو ریاست کی آرٹ اکیڈیمی چھاپے گی مگر ان کے مجموعہ کلام میں وہ نظمیں شامل نہیں کی جائیں گی جو انھوں نے جاگیردارانہ نظام کی تعریف میں لکھی ہیں اور جو بدقسمتی سے زیادہ مقبول ہیں۔ اکیڈیمی کے ایک ترجمان نے کہا ہے: مسٹر سامیال نے بہت سی ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو زرعی اصلاحات کے بارے میں ہیں۔ (قائد)

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

رشک لکھنوی

دبستان لکھنؤ کے بانی شیخ امام بخش ناسخ (متوفیٰ ۱۲۵۴ھ) کے شاگردوں میں جو مرتبہ رشک لکھنوی نے حاصل کیا وہ دوسروں کے حصے میں نہیں آیا۔ انھوں نے اپنے استاد کے وضع کیے ہوئے اصول شاعری پر بڑی سختی سے عمل کیا اور حک و اصلاح زبان کے وہ کام جسے شیخ ناتمام چھوڑ گئے تھے انجام تک پہنچایا۔

رشک کا نام میر علی اوسط، لقب والا جاہ اور تخلص رشک ہے ان کے والد میر سلیمان (متوفیٰ ۱۲۱۴ھ) اپنے وقت کے بہت مشہور و معروف محدث اور جملہ علوم متداولہ کے کامل تھے۔

رشک کے اجداد واسطے سے ہندوستان وارد ہوئے اور قنوج میں قیام کیا، کچھ مدت وہاں رہ کر فیض آباد میں آ بسے، رشک کی ولادت فیض آباد ہی میں لگ بھگ ۱۲۱۲ھ میں ہوئی۔

رشک نے جو قطعات تاریخ نظم کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سات سال کی عمر میں وہ باپ کے سائے سے محروم ہو گئے اور ان کی پرورش چچا نے کی، ۱۲۲۳ھ میں وہ بھی فوت ہو گئے، لیکن ان کی زندگی ہی میں یہ اپنے چچازاد بھائی میر امانت علی کے ساتھ رہنے لگے جنھوں نے اپنی نگرانی میں انھیں اعلیٰ تعلیم دلوائی اور بقول صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبا "علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ" کر دیا۔

فیض آباد اس وقت بڑے بڑے شعرا اور ارباب کمال کا مسکن ہو رہا تھا، ہر وقت وہاں شعر و شاعری کا ہنگامہ گرم رہتا، رشک کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا اور میر مستحسن خلیق (متوفیٰ ۱۲۶۰ھ) کی خدمت میں آنے جانے اور اپنا کلام دکھانے لگے۔ رشک نے سعادت خاں ناصر سے خود بیان کیا کہ اس زمانے میں آغا تقی ترقی (۱۲۴۵ھ) کے در دولت پر بڑی دھوم دھام کے مشاعرے ہوتے اور اہل کمال کا بڑا مجمع ہوتا تھا، میں استاد خلیق سے اصلاح لے کر مشاعروں میں غزل پڑھتا اور داد پاتا تھا، لیکن جناب عالیہ بہو بیگم صاحبہ کے انتقال (۲۵ ج ۱۲۳۰ھ) کے بعد فیض آباد کی یہ صحبتیں درہم برہم ہو گئیں اور سارے عمائدین شہر نے لکھنؤ کا رخ کیا، میرا روزگار جاتا رہا، غرض کہ میں نے بھی لکھنؤ کی سکونت کا قصد کر لیا، چونکہ میں اس وقت لکھنؤ میں اجنبی تھا اس وجہ سے میں نے میر صاحب سے وہاں کے مشاعروں کا حال دریافت کیا انھوں نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں شیخ ناسخ ہیں ان کی طبیعت بہت متین ہے اور فی زمانہ ایسا کوئی شاعر وہاں موجود نہیں تم ان کی خدمت میں حاضر ہونا اور اپنا کلام دکھانا، میں نے سفارش کا خط مانگا تو فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، فقط میرا سلام شوق کہہ دینا چنانچہ میں ربیع الاول ۱۲۳۱ھ میں لکھنؤ پہنچا اور ایک روز میر امجد علی ہوشیار کے ساتھ شیخ صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا، غزل پیش کی اور شرف شاگردی حاصل کیا۔ ناصر لکھنوی نے تذکرہ خوش معرکہ زیبا (۱۲۶۲ھ) میں یہ واقعات "ترجمۂ رشک" کے سلسلے میں یوں تحریر کیے ہیں۔

"شاعر سترگ، ممدوح خرد و بزرگ، زیور علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ، نظم میں ایک نظام، کلام میں متانت، تمام شعروں میں سلاست اشک، میر علی اوسط تخلص رشک کلام اس کا منظور ضمائر خواص کے مرغوب، شاگرد رشید شیخ امام بخش ناسخ بلکہ ان کے برابر محسوب، ان کی زبانی بیان کہ مسکن اور مولد فیض آباد، اور بدو سن سے شعر گوئی پر طبع رواں، فکر موزوں، سواد طبیعت بنر کی کا سبب صحبت مشاعرہ پر طبیعت راغب۔ اس نقل کا ان کی زبان سے بیان کہ ان روزوں میں مرزا محمد تقی خان ترقی کے دولتخانے میں صحبت مشاعرہ مقرر اور روز مقررہ وہاں ازدحام اہل فضل و ہنر ہوتا تھا۔ چاہ و ناچار میر مستحسن خلیق کو کہ فیض آباد میں ان سے کوئی بہتر نہ تھا غزل دکھاتی، سامعین اور ہنرمندوں کی زبان سے واہ واہ پائی، چندے زمانہ اسی طور پر گذرا ۱۲۳۱ھ میں جناب عالیہ نے انتقال کیا اور سررشتہ روزگار کا درہم برہم ہوا، اور عزم سکونت لکھنؤ مصمم ہوا، اس وقت بہ سبب اپنی اجنبیت کے دریافت حال شعرائے لکھنؤ میر صاحب مرحوم سے کیا، اور سفارش چاہی، میر صاحب نے بعد تامل کے فرمایا کہ میرے دوستوں میں شیخ امام بخش ناسخ ہیں کہ طبیعت ان کی بہت متین اور فی زمانہ ایسا اور کوئی شاعر نہیں، ان کی خدمت میں حاضر رہنا، میں نے خط سفارش کا طلب کیا فرمایا کہ اس کی کیا حاجت ہے فقط میرا اسلام شوق کہنا اور اپنا کلام پڑھنا۔ القصہ فیض آباد سے لکھنؤ میں آنے کا اتفاق ہوا، اور میر امجد علی ہوشیار کی معرفت شیخ صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا، بہ طریق نذر بعد سلام و پیغام ایک غزل پیش کی، سردست متزین اصلاح سے نہ ہوئی، فرمایا کہ اسے چھوڑ جاؤ کہ اصلاح کی جائے گی اسے سونپ کر رخصت ہوا۔ دو چار روز کے بعد جو گیا فرمایا کہ وہ مسودہ جاتا رہا آزردگی کو راہ نہ دو، اگر تمہیں نے کہی تھی پھر کہہ سکتے ہو اسی زمین میں شعر کہہ کر لے گیا، شیخ صاحب نے اسے زیور اصلاح سے آراستہ فرمایا، وہ زمانہ شاگردی ماہ ربیع الاول ۱۲۳۱ھ تھا اب جو میں نے تامل کیا کہ تاریخ اپنی شاگردی کی لکھوں، بہ سہل تر یہ ہاتھ آئی یعنی لفظ "ناسخ" اور "رشک" مل کے تاریخ حاصل ہوئی یہ عجیب تعشب اتفاقیہ ہے

سے۔

رشک لکھنؤ پہنچے تو یہاں معتمد الدولہ سید محمد معروف بہ آغا میر کے صاحب زادوں کے اتالیق مقرر ہو گئے، ۱۲۳۴ھ میں نواب موصوف کو وزارت ملی اب کیا تھا ان پر روپے پیسوں کی بارش ہونے لگی اور آٹھ سال بڑی فراغت میں کٹے ۱۲۴۲ھ میں نواب نصیر الدین حیدر فرماں روا ہوئے، رشک کے مربی کا کھیل بگڑا معزول ہوئے، تو یہ بھی نواب صاحب کے ساتھ کانپور چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔

۵ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ کو معتمد الدولہ بہادر نے قضا کی، ان کے بڑے بیٹے امین الدولہ آغا علی خاں بہادر عرف جانشین ہوئے انھوں نے اپنے استاد کو خلعت و انعام سے نوازا، اور اب وہ بحیثیت "کارکن" کے کام کرنے لگے اور کچھ ہی عرصہ میں نواب صاحب کے الطاف کریمانہ سے بے نیاز ہو گئے۔

منیر شکوہ آبادی نے اپنے دیوان منتخب عالم کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ استاد رشک کا اکثر "لکھنؤ" کانپور، مرشد آباد و دیگر بلاد نزدیک و دور کے شاعروں میں میرا ساتھ ہوتا تھا! لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے منیر نے لکھا ہے کہ شاہی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں "تصویر پشت آئینہ" طرح تھی رشک مغفور نے بھی ایک غزل کہی اور اکثر قافیے مکرر اور محض استادی ظاہر کرنے کے لیے نظم کیے ایک شعر میں "تسخیر پشت آئینہ" جو کہا تو نواب عاشور علی خاں بہادر (متوفی ۱۲۷۷ھ) نے سر مشاعرہ "تسخیر" کے قافیہ پر اعتراض کر دیا، حالانکہ میر رشک نے تسخیر کی بنا بہار عجم سے کی تھی مگر ارباب تحقیق و تنقید نے سنانی اصنیاد کہا، نواب صاحب نے کیا اعتراض کیا تھا اس کا تو پتہ نہ چل سکا ہاں وہ غزل مل گئی جس میں وہ شعر ہے جس پر اعتراض ہوا تھا چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دست بوسی کرتی ہے تصویر پشت آئینہ
اے جنوں اللہ رے تقدیر پشت آئینہ
تیرے منہ نے آئینہ کو یوں مسخر کر لیا
جس طرح پارے سے ہے تسخیر پشت آئینہ
حیرتی ہوں کرتے پیچھے جو لپٹا رہتا ہوں
دل کہتے ہیں مجھے تصویر پشت آئینہ
منہ نہ دیکھیں لوگ تو ہرگز نہ دیکھیں ہاتھ میں
روئے آئینہ سے ہے توقیر پشت آئینہ
دیکھیں جب اس خجل کی لکیریں یک قلم
رشک انھیں سمجھا خط تقدیر پشت آئینہ [1]

لکھنؤ میں دریائے گومتی کے اس پار محلہ ارادت نگر (نزد شیعہ ڈگری کالج) میں رشک کی بی بی کا آبائی کچا مکان تھا، اسی میں وہ رہتے تھے، (۱۲۸۵ھ) کے سیلاب کے بعد اسے پختہ کرا لیا تھا، رشک کے کربلائے معلی جانے کے بعد ان کے بڑے بیٹے حکیم میر علی خاص شوق کی کئی برسوں اسی میں سکونت رہی۔

کانپور میں رشک کو ہر طرح کا اطمینان و سکون میسر آیا، فکر معاش سے بے نیاز ہو کر ادب کی خدمت میں لگ گئے وہیں انھوں نے اپنے تینوں دیوان، لغت اور مثنویاں مرتب کیں، استاد کے انتقال کے بعد ان کا کلیات اور مثنوی سراج نظم مدون کرکے شائع کرائی اور پھر اپنی تصنیفات کو بھی منظر عام پر لے آئے جو ان کی زندگی ہی میں مقبول و مشہور ہو کر شہرت عام کا باعث ہوئیں۔

غدر سے چند سال قبل رشک نے عتبات عالیات کی زیارت کی غرض سے وطن چھوڑ دیا تھا اور پھر واپس نہ آئے، منیر شکوہ آبادی کے بیان کے مطابق کربلائے معلی سے اکثر یہاں اپنے سلام بھیجے رہتے تھے، غالباً وہاں پہنچ کر غزل کا کہنا بھی ترک کر دیا تھا، آخر وہیں محرم اور رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ کے درمیان کسی تاریخ کو سفر آخرت اختیار کیا، تدبیر الدولہ سید مظفر علی اسیر لکھنوی (متوفی ۱۲۹۹ھ) نے جن سے اکثر ان کی معاصرانہ چشمک چلا کرتی تھی "تاریخ وفات کہی ؎

گرد افسوس صد افسوس تھا — از قضا میر علی اوسط رشک
گفت تاریخ سراسیمہ دلم — شد کجا میر علی اوسط رشک
۱۲۸۴ھ

کربلائے معلی جانے کے متعلق صاحب "تذکرہ آب بقا" خواجہ عشرت لکھنوی نے لکھا ہے کہ "رشک کا ایک ہی لڑکا تھا اور ایک ہی پوتا، پہلے لڑکا اور اس کے بعد پوتا مرا اس کا صدمہ اس قدر ہوا کہ کربلا چلے گئے" اور پھر وہاں جانے کا زمانہ ابتدائے ۱۲۷۷ھ تحریر کیا ہے، میرے نزدیک یہ دونوں بیانات صریحاً غلط ہیں کیونکہ رشک کے کربلا جانے کے مدت بعد تک ان کے بیٹے

(باقی صفحہ ۱۹)

۱؎ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی)

۲؎ منیر رشک ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور صاحب دیوان شاعر تھے ان کا دیوان جس کی ابتدا میں چند قصائد بھی ہیں ۱۲۶۳ھ میں چھپا تھا تعداد صفحات ۱۰۴

۳؎ سنان دل خراش (قلمی)

۱؎ سید محسن علی نے خواجہ وزیر لکھنوی کے حال میں لکھا ہے کہ جب شاہ نصیر لکھنؤ آئے اس وقت یہاں کے شعرا کو یہ طرح دی تھی چنانچہ اسیر، آتش، امانت، محسن، ثاقب اور افضل وغیرہ کی غزلیں اسی طرح میں موجود ہیں۔

۲؎ صفحہ ۴۹

غزلیں

مہر چند کوثر

حدیثِ سرو و سمن حالِ برگ و بار نہ پوچھ
قفس نصیب سے افسانۂ بہار نہ پوچھ

کہاں کہاں نہ گئے تجھ کو ڈھونڈنے والے
کہاں کہاں نہ کیا تیرا انتظار نہ پوچھ

اسی خطا پہ کہ اک دن لیا تھا نام ترا
سہے جو ہم نے ستم ہائے روزگار نہ پوچھ

بھرم بنا ہے اربابِ عقل و دانش کا
جو راز اہلِ جنوں پر ہیں آشکار نہ پوچھ

جہانِ کفر کو نفرت سے دیکھنے والے
حرم نشیں بھی ہیں کس درجہ دیں دار نہ پوچھ

دلِ تباہ کی روداد اشک و آہ نہیں
جو کر رہی ہے مری چشمِ خوں فشار نہ پوچھ

خزاں میں بھی یہ تباہی مچی نہ تھی کوثر
چمن میں لائی جو ویرانیاں بہار نہ پوچھ

سعادت نظیر

خبر ان کو بھی ہے دردِ نہاں کی
یہ شہرت اور میری داستاں کی!

یہ حالت ہے ابھی سے گلستاں کی
کہ فصلِ گل میں رنگت ہے خزاں کی

زمیں والوں کی عظمت، اللہ اللہ
کمر خم ہو گئی ہے آسماں کی

مبارک ہو ضیائے خندۂ گل
فضا تاریک سی تھی گلستاں کی

دکھا منزل سے ہے ناآشنائی
وہی رفتار ابھی ہے کارواں کی

سنا جب کوئی ماضی کا فسانہ
اٹھی اک موجِ یادِ رفتگاں کی

ہنسی آنے لگی ہے حالِ دل پر
بدل دی عشق نے صورت فغاں کی

پیامِ زندگی ہے، اے سعادت
ادا ہر ایک اس آرامِ جاں کی

یعقوب راہی

راہ میں رہبری سے ڈرتے ہیں
آپ کی دوستی سے ڈرتے ہیں

کر تو سکتے ہیں بات ہم لیکن
حسن کی برہمی سے ڈرتے ہیں

جو سمجھتے ہیں زندگی کو عزیز
لوگ وہ خودکشی سے ڈرتے ہیں

پیچ و خم اور بھی ہیں منزل تک
راہرو کیوں ابھی سے ڈرتے ہیں

آدمیت کا یہ عروج تو دیکھ
آدمی آدمی سے ڈرتے ہیں

پیکرِ روشنی کے دیوانے
جانے کیوں تیرگی سے ڈرتے ہیں

رحمٰن جامی

وہ بھی اب ملتے ہیں ہم سے میہمانوں کی طرح
اور ہم بھی ہو گئے ہیں میزبانوں کی طرح
کتنی دقت ہو رہی ہے ان کو اب کے بات میں
جب سے وہ پیش آ رہے ہیں مہربانوں کی طرح
ہم نے تنکوں کو سجایا ہے کچھ اس انداز سے
اب قفس بھی لگ رہے ہیں آشیانوں کی طرح
پھر سے اے رحمٰن جامی آنے والے روز و شب
کاش ہو جائیں حسیں بیتے زمانوں کی طرح

لہریں

اسرار اکبرآبادی

ادھر آ کے تم بھی تو کھڑکی سے دیکھو
شمالی پہاڑوں کے اوپر سے ہو کر
وہ مشرق سے مغرب میں پہنچا ہے سورج
سمندر میں ڈوبے ہیں رنگوں کے آنچل
جنوبی پہاڑوں پہ الجھے ہیں سائے
ڈھلانوں پہ لرزاں ہیں کرنوں کے پیکر
فضائیں دراریں، دراروں پہ بادل
بلندی کے پھندے
نہ کوئی تسلسل نہ سیدھی قطاریں
تمدن کا ساری فضا پر اثر ہے
نظارے ہی نظروں کو جکڑے ہوئے ہیں
ہواؤں کے دامن کو پکڑے ہوئے ہیں
وہ نیچے ادھر
چند پرچھائیاں سی خیالوں کے تابوت لے جا رہی ہیں
محبت کے رشتوں کو الجھا رہی ہیں
وہ دیکھو تجسس نے پھر تیر پھینکا
وہ سینا پھٹا
وہ پتھر بھی ٹوٹے
وہ ابھریں لرز کر پرانی صلیبیں
صلیبوں کی کیلوں میں لٹکے ہیں سینے
جوانی کے آنسو، وہ مجبور آہیں
وہ خاموش جذبے
وہ پُرپیچ راہیں
ازل کے سفر کی لرزتی سی لہریں
کہیں ہم کو گرا کر چلی آ رہی ہیں،
وہ جنگلی جہازوں کی لمبی قطاریں
وہ چیخے پرندے
وہ آواز ابھری
وہ سورج چھپا اور چھایا اندھیرا
اندھیرے میں ہوتی ہے آنکھوں کو وحشت
خود اپنی ہی دشمن ہے اندھی سیاست
وہ دیکھو
ادھر مقبروں کے پیچھے
پہاڑوں کے دامن کے سائے کے نیچے
ابھرتا ہوا چاند بھی آ رہا ہے
کسی کا وہ آنچل سا لہرا رہا ہے

صفحہ ۴ سے آگے

شوق لکھنوی زندہ رہے۔ منیر کے دیوان موسوم بہ نظم منیر میں ایک خط موجود ہے جس سے کم از کم صفر ۱۲۸۳ھ تک تو شوق کی حیات ثابت ہی ہوتی ہے۔ رہا کربلا جانے کا زمانہ تو وہ ۱۲۹۷ھ ہے جو جلال لکھنوی کے دیوان کرشمۂ گاہ سخن (۱۳۰۲ھ) کے ایک قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے ؎

قدسیہ شاہ شہیداں کے مزار پاک کا
قصد فرماتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے
پوچھ کر تاریخ ہاتف سے پکار اٹھا جلال
کربلا جاتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے
۱۲۹۷ھ

اولاد۔

رشک کی کئی اولادیں ہوئیں جن کی ولادت یا وفات کی تاریخیں ان کے مطبوعہ کلیات اور دیوان سوم میں موجود ہیں لیکن شہرت صرف شوق کے حصے میں آئی۔

ان کا نام سید علی ضامن اور تخلص شوق ہے، یہ اپنے والد ماجد کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے، رشک نے ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی، حکیم تھے اور لکھنؤ ہی میں طبابت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی عروض کی کتاب "ریاض العروض" میں لکھا ہے کہ انھیں غدر ۱۸۵۷ء میں وطن سے نکلنا پڑا، تخمیناً چار سال مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں طبابت کرتے رہے۔ ۱۲۷۸ھ میں وہ کانپور اپنے والد کے مربی مہر کے بیٹے نواب بہادر علی خاں حشمت کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے شوق سے عروض کی ایک کتاب کے لکھنے کی فرمائش کی۔ کچھ عرصہ تو وہ ٹالتے رہے، آخر ۱۲۷۹ھ میں انھیں یہ فرمائش پوری کرنا پڑی اور صرف ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں کتاب لکھ ڈالی۔ "ریاض العروض" شوق کے ایک دوست مجرم کی فرمائش اور مشورے سے بڑی صحت کے ساتھ ۸/ رجب ۱۲۷۹ کو مطبع علی بخش خاں، واقع کرہ محمد علی خاں، لکھنؤ سے ۴۴ صفحات پر شایع ہوئی تھی۔

مجھ سے جناب سید سرفراز حسین صاحب مرحوم خبیر لکھنوی بیان کرتے تھے کہ جب میں ۱۹۴۰ء میں زیارت کے لیے کربلائے معلیٰ گیا تو وہاں ایک بہت ضعیف مرد مومن سے ملاقات ہوئی جن کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ وہ میر علی اوسط کے پوتے ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشک کی اولاد امجاد اب تک عراق میں موجود ہوگی۔

رشک مصلح زبان اور شاعر دونوں حیثیتوں سے اپنے وقت کے باکمال استاد تھے، انھیں تاریخ گوئی سے بھی خاص دلچسپی تھی، ان کے مطبوعہ کلیات میں تخمیناً ۷۰ قطعات تاریخ ہیں جن سے ان کی تاریخ گوئی کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ بقول صاحب گل رعنا بات بات پر تاریخ کہتے تھے اور مرنے جینے کی تاریخوں کا تو انھوں نے ٹھیکہ لے رکھا تھا ادھر کسی کا دم نکلا انھوں نے تاریخ نکال لی کوئی پیدا ہوا، نال کٹنے میں دیر ہو تو ہو مگر تاریخ میں دیر نہیں لگتی تھی صوری و معنوی تاریخ کہتے تھے جو تعمیہ اور تخرجہ سے عاری ہوتے ہوئے بڑی برجستہ اور مناسب ہوتی ہیں نمونہ کے طور پر چند قطعات ملاحظہ ہوں۔

تاریخ انتقال خواجہ حیدر علی آتش ؎

خواجہ و آتش تخلص نام شاں حیدر علی
صبح روز چار شنبہ بود و مردند از قضا
رشک صوری و معنوی بنوشت تاریخ وفات
از محرم بست و پنجم صبح ہے ہے اربعا
۱۲۶۳ھ

تاریخ انتقال شیخ ناسخ ؎

ناسخ استاد رشک حسرت عمر
بود اے ہے بہ سال شصت و نہم
رشک تاریخ انتقال نوشت
مرد اے ہے بہ سال شصت و نہم
۱۲۵۴ھ

تاریخ انتقال زوجۂ رشک

زوجۂ ام اے رشک ایں دنیائے فانی واگذشت
بود آں ماہ ربیع الآخر اے افسوس وائے
بہر یاد روز و تاریخ و مہ و سال وفات
گفتم از ہاتف مرا راہے نما اے رہنمائے
یافتم ایں مصرع تاریخ با جملہ صفات
جمعہ و بست و چہارم ماہ چارم حیف وائے
۱۲۵۱ھ

تصانیف۔

(۱) مثنوی حدیث رجعت حیدری (۱۲۴۸ھ)
(۲) نفس اللغۃ (۱۲۵۹ھ)
(۳) کلیات (طبع ۱۲۶۳ھ)
(۴) دیوان سوم (۱۲۹۷ھ)

۱؎ ناسخ کی عمر کے بارے میں محققین میں بڑا اختلاف ہے مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ان کی عمر ستر سال بتائی ہے، بعض دوسرے لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ وہ ۶۰ برس سے زیادہ کے نہیں تھے۔ اب معلوم ہو سکتا ہے کہ آزاد اور دوسرے حضرات کی نظر سے یہ قطعہ تاریخ نہیں گذرا ورنہ ایسی فاحش غلطی نہ ہوتی

مثنوی حدیث رجعت مہدی۔

اس مثنوی میں رشک نے بارہویں امام مہدی آخرالزماںؑ کی رجعت کے واقعات نظم کیے ہیں، یہ پہلی بار مطبع نگین لکھنؤ سے شایع ہوئی تھی، سال انطباع رشک ہی کے ایک مصرع "حدیث رجعت والائے ہادی" سے ۱۲۹۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ "یہ نظم پاک مقبول الٰہی" مادہ تاریخ ہے جس سے سال تالیف ۱۲۴۸ھ نکلتا ہے، تعداد صفحات ۲۶ اور اشعار کی تعداد تخمیناً ۹ سو ہے، اسپرنگر نے اپنے کیٹلاگ میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔

سبب تالیف میں رشک لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ اور ان کے استاد شیخ ناسخ کانپور میں مقیم تھے کہ ایک صاحب استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا نام شیخ امداد علی تھا، انھوں نے شیخ صاحب سے بعد اصرار عرض کیا کہ آپ حدیث رجعت مہدیؑ اردو میں نظم کر دیجیے چونکہ ان دنوں استاد بہت مصروف تھے اس لیے انھوں نے مجھ سے فرمایا ؎

کہ مجھ کو ہے بہت کم فرصت وقت
نہیں پاتا ہوں اک دم فرصت وقت
اگرچہ ترجمہ منظوم ہو جائے
تو ذوق طبع بھی معلوم ہو جائے
بھلا انجام بھی اس سے بہت ہو
بقائے نام بھی اس سے بہت ہو
مفصل ہر جگہ اصلاح دوں گا
جو کچھ رہ جائے گا میں دیکھ لوں گا
سنی میں نے جو یہ تقریر عالی
کلاہ فخر گردوں پر اچھالی

رشک لکھتے ہیں کہ اس مثنوی میں جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں ان کا ماخذ معتمد ابن سلیمان کی کتاب "بصائر" ہے۔ ترجمہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ مفضل امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کرتا ہے کہ ہم جس مہدیؑ کے منتظر ہیں وہ کب ظہور فرمائیں گے؟ امام قرآن مجید کی آیتوں کے حوالے سے قیامت اور خروج امام کے واقعات بیان فرماتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

مفضل نے بصد قلب اصفا
جناب جعفر صادق سے پوچھا
کہ میں جس پیشوا کا منتظر ہوں
ظہور پاک کا جس کے مقر ہوں
مفضل سے امام انس و جاں نے
یہ فرمایا زبان خوش بیاں سے
کیا یہ امر پوشیدہ خدا نے
کوئی وقت معین تا نہ جانے
تعین وقت کا جس نے کیا ہے
شریک علم و دانست خدا ہے
کوئی ساعت مقرر جس نے کی ہے
وہ اسرار خدا کا مدعی ہے

یہ مثنوی ادبی نقطہ نظر سے قابل اعتنا نہیں، رشک نے فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ و تراکیب استعمال کر کے زبان کو بہت ثقیل اور بے لطف کر دیا ہے جس کے باعث یہ محض بے کیف منظوم ترجمہ ہو کر رہ گئی ہے، اس میں شاعرانہ لطافتیں اور محاسن تلاش کے باوجود نظر نہیں آتیں، پھر بھی لکھنوی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

نفس اللغہ۔

رشک کو زبان کی تراش خراش، اور دیکھ بھال کا چسکا فیض آباد میں میر خلیق (۱۲۶۰ھ) کی صحبت میں پڑا تھا جو اس وقت ادبی دفتر اصطلاحات و محاورات میں بیر منشی تھے، چنانچہ اس پر مزید جلا لکھنؤ پہنچ کر اس وقت ہوئی جب کہ وہ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے اپنا لغت جس کا تاریخی نام نفس اللغہ ہے (سال اتمام ۱۲۵۶ھ) بڑی محنت تحقیق و تلاش سے مرتب کیا اور اس میں مفرد و مرکب الفاظ و محاورات کے مطالب اور موقع بہ موقع ضروری قواعد لکھ کر بقول مولانا عبدالحیٔ (متوفی ۱۳۴۱ھ) ملک پر احسان عظیم کیا، مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایسی مفید کتاب کی اب تک مکمل اشاعت نہ ہونے کے باعث اس کے مطالعہ اور استفادہ سے محروم ہیں۔

اس لغت کا صرف ایک حصہ از الف تا ت "نشر" کاکوروی نے شایع کر دیا ہے، معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ یہ چار حصوں میں چھپنے والا تھا لیکن ایک ہی حصہ نکل سکا۔ استاذی جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی مدظلہ کی نظر سے اس لغت کا وہ قلمی نسخہ گذر چکا ہے جو خاندان میر انیس کی ملک تھا اور جسے خود میر صاحب مرحوم اور ان کے بیٹوں نے اپنے ہاتھ سے نقل کیا اور مزید حاشیے بھی لکھے تھے۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ انیس جیسے صاحب زبان کے نزدیک بھی یہ اردو کا مستند و معتبر لغت تھا جس سے موصوف استفادہ فرماتے رہتے تھے۔

دواوین۔

رشک نے اپنے دو دیوان ایک ساتھ حاجی محمد حسین کے زیر اہتمام ۱۲۹۳ھ میں لکھنؤ سے شایع کرائے تھے (دیوان اول متن میں اور دوم حاشیے پر) پہلے دیوان کا تاریخی نام نظم مبارک (سال اتمام ۱۲۵۳ھ) اور دوسرے کا نظم گرامی ہے جس سے خاتمے کا سنہ ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

کلیات کی ابتدا میں پانچ مخمس ہیں صفحہ ۲۰ سے غزلیں شروع ہوتی ہیں آخر میں چند قطعے، رباعیاں اور تخمیناً ایک سو سترہ قطعات تاریخ ہیں۔ غلط نامے اور قطعات سال انطباع سمیت پوری کتاب کے ۲۲۴ صفحے ہوتے ہیں۔ ہر صفحے میں تنگ بھگ ۵ سطریں ہیں۔

(باقی آئندہ)

مراسلات

طاہرہ دیوی شیرازی کے بارے میں

(۱)

ہفت روزہ "ہماری زبان" علی گڑھ میں جناب عبد الودود نے استفسار کیا ہے کہ اردو کے افسانوی ادب کی پر اسرار مصنفہ طاہرہ دیوی شیرازی کی حیثیت کیا ہے۔ سوال خیال انگیز ضرور ہے لیکن تعجب خیز نہیں، اس لیے کہ آج سے قریباً تیس سال قبل اس نام کی ایک ہستی ادیبہ نے اردو کی ادبی دنیا میں ایک کہرام بپا کیے رکھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے میں صنفِ لطیف ادب کے میدان میں ابھی بالکل نووارد تھی، دوسرے طاہرہ دیوی شیرازی نے جس بے باکی سے جنسی عریانی کا مظاہرہ اپنے افسانوں میں کیا اس کی توقع کم از کم اس دور کی عورت سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ صنفِ نازک ہمارے ملک میں ہر مرد کی کمزوری رہی ہے۔ چنانچہ بہت سے کمزور طبع لوگ جن میں ثقہ ادیب، مدیر اور شاعر بھی شامل تھے اس پر اسرار مصنفہ کے نادیدہ عاشق ہوگئے اور کئی ایک نے تو اپنی فطری کمزوری کے جوہر ذاتی خطوط میں بھی ظاہر کر ڈالے۔

حقیقت یہ ہے کہ طاہرہ دیوی شیرازی کے پردے میں ایک ادبی طاہر دیو اپنی جودتِ فکر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایک ادبی محفل میں انھیں احساس ہوا کہ نام میں بھی خاصی جاذبیت ہوتی ہے اور ادبی دنیا میں مقبول ہونے کے لیے جاذب اور پرکشش ادبی نام بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس تحریک کے تحت انھوں نے اپنا ادبی نام طاہرہ دیوی شیرازی محض اس وجہ سے منتخب کیا کہ مردوں کی نسوانی کمزوری کا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ چنانچہ اس قلمی نام سے سب سے پہلا افسانہ ساقی دہلی میں اشاعت کے لیے موصول ہوا۔ یہ افسانہ ابھی اشاعت کے مراحل طے کر ہی رہا تھا کہ "نگار" میں اسی نام سے ایک افسانہ "بازی گر" کے عنوان سے شایع ہوگیا۔ حلقۂ تعارف بڑھانے کے لیے کچھ اور رسائل میں بھی افسانے شائع کروادئے گئے۔ وہ لوگ جو مصنف کے اصلی نام پر شائع شدہ مضامین کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے اس نئے نسوانی نام پر مرمٹے اور بے شمار لوگ رشتۂ تعلق ہونے لگے۔ ایک بزرگ نے دو چار خطوں کے بعد شادی کی درخواست کر ڈالی۔ ایک اور وارفتۂ خیال نے اپنی بیوی کی کم ذوقی کا گلہ شروع کردیا۔ ایک شاعر نیک نام نے ان کی مدد سے معاش کا مسئلہ حل کرنا چاہا۔ بعض عقیدت مند مدیرانِ جرائد نے تصویر مانگی تو مصنف نے ایک آرٹسٹ کی مدد سے فرضی تصویر بھجوا دی جس میں جنسی کشش بہت زیادہ اشتہا انگیز تھی۔ اس تصویر نے ان وارفتہ خیالوں کو اور دیوانہ بنادیا اور کئی لوگ مصنفہ کی تلاش میں نکلنے کا سفر تک کر آئے۔ کچھ عرصے کے بعد ان افسانوں کا مجموعہ "سحر بنگال" کے نام سے ساقی بک ڈپو دہلی نے شائع کیا تو سب سے پہلے عظیم بیگ چغتائی نے "ادبِ لطیف" میں ایک تبصرہ لکھا جس میں مصنفہ کی شخصیت کے بارے میں اختلافِ رائے کیا گیا۔ اور صاف لکھا گیا کہ اس قسم کی جذبات نگاری کسی طاہر دیو کا کام ہی ہو سکتا ہے۔ مصنف اس حملے کی تاب نہ لاسکے اور فوراً زیر زمین چلے گئے!

یہ مصنف فضل حق قریشی تھے!

کچھ عرصے کے بعد یہ ہنگامہ سرد ہوگیا اور طاہرہ دیوی شیرازی لوگوں کے ذہن سے محو ہونے لگی تو جناب فضل حق قریشی اس گڑھے مردے کو ایک مرتبہ پھر قبر سے نکال لائے۔ اب انھوں نے "نرملا کے خطوط" کے عنوان سے طاہرہ دیوی شیرازی کو موصول خطوط پر مبنی ایک دلچسپ افسانہ تراشا جو "آجکل" یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء میں مصنف کے نام سے ہی شایع ہوا۔ فضل حق قریشی طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے جو خطوط مختلف لوگوں کو لکھتے تھے ان کی نقول بھی اپنے پاس رکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ طاہرہ کے خطوط ایک مسلسل مضمون کی صورت میں ایک اور فرضی نام "انیس" کے تحت یکم اپریل ۱۹۴۵ء کو "آجکل" میں شایع کیے گئے۔ ان خطوط کی اشاعت کے بعد طاہرہ دیوی شیرازی ایک مرتبہ پھر ادبی دنیا میں وارد ہوگئی اور قریباً دو تین سال تک ساقی، کہکشاں وغیرہ رسائل میں افسانے لکھتی رہی۔ آخری دور کے افسانے زیادہ تر تراجم ہیں اور ایک منجھی ہوئی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس وقت تک طاہرہ دیوی کی شخصیت چنداں پر اسرار نہیں رہی تھی اور بہت سے لوگوں کو علم ہوگیا تھا کہ اس فرضی نام کے پیچھے فضل حق قریشی چھپے ہوئے ہیں۔

"اردو ڈائجسٹ" میں قریباً بیس سال کے بعد جناب فضل حق قریشی نے طاہرہ دیوی شیرازی کی یاد پھر تازہ کی ہے اور "پردہ اٹھتا ہے" کے زیرِ عنوان اس حکایتِ پارینہ کی تفصیل پوری لذتیت سے بیان کردی ہے۔ وہ ادیب، شاعر اور ذکی الحس لوگ، جو اس زمانے میں طاہرہ کے اسیرِ دام ہو چکے تھے اب فوت ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کے خطوط شائع کرکے ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کونسی ادبی خدمت ہے اور اس کا بھی کیا ثبوت ہے کہ یہ خطوط دراصل انھیں حضرات کے لکھے ہوئے ہیں؟ یا یہ بھی جناب فضل حق قریشی ہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں!

سستی شہرت کے لیے فضل حق قریشی کا یہ کارنامہ چنداں اہم نہیں اور انھیں چاہیے کہ وہ کم از کم مرحومین کو اب ضرور معاف کردیں۔

(انور سدید)

(۲)

۱۵ر جنوری ۶۷ء کے "ہماری زبان" میں مراسلات کے تحت جناب عبدالودود صاحب کا جو استفسار شایع ہوا ہے، اس کے جواب میں عرض ہے کہ "سحر بنگال" نامی افسانوں کا مجموعہ حقیقتاً اردو کے ممتاز ادیب فضل حق قریشی کی تخلیق ہے

موصوف نے اپنے افسانوں کی طرف اہلِ نقد کو متوجہ کرنے کے لیے طاہرہ دیوی شیرازی کا روپ دھارا تھا اور اس وقت کے مدیرانِ رسائل سے رسم مراسلت قائم کی تھی۔

فضل حق قریشی صاحب نیاز فتح پوری کے مداحوں میں نہیں پرستاروں میں ہیں۔ نیاز کی انشاء پردازی اور افکار و خیالات سے وہ بقدرِ شوق متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ نیاز اور ان کی شخصیت سے اس والہانہ شیفتگی کا اثر ان کی نثر نگاری پر بھی پڑا ہے اور غالباً اسی وجہ سے بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا کہ "سحرِ بنگال" کے پردے میں نیاز صاحب ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸-۱۹۱۷ء میں خود نیاز صاحب بھی "قمر زمانی بیگم" کے روپ میں شاہ دلگیر کے ساتھ اس طرح کا مذاق کر چکے تھے چنانچہ جب طاہرہ دیوی شیرازی کے وجود پر لوگوں کو شبہ ہوا تو انھوں نے ان افسانوں کو بھی نیاز سے منسوب کر دیا لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ فضل حق قریشی مقیم حال کراچی نے طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے یہ افسانے ۲۴-۱۹۲۳ء میں اردو کے ممتاز رسائل میں شایع کرائے تھے۔

"سحرِ بنگال" میں طاہرہ دیوی کی جو تصویر ہے وہ بھی ذہنی ہے اور صرف اس لیے شایع کی گئی ہے کہ قارئین کو طاہرہ دیوی شیرازی کے وجود کا یقین دلایا جا سکے۔ ہوا بھی یہی۔ بہت دنوں تک لوگ اسی مغالطے میں رہے اور "سحرِ بنگال" کے افسانوں کی داد، فضل حق قریشی کے بجائے طاہرہ دیوی شیرازی کو دیتے رہے۔ طاہرہ دیوی شیرازی کی ڈاک چونکہ فضل حق قریشی، کلکتے کے پتے پر اپنے ایک رازدار کے توسط سے منگاتے تھے اس لیے عام طور پر لوگ طاہرہ دیوی کو بنگال کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون سمجھتے تھے خود طاہرہ دیوی نے بھی اپنے مستفسرین پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئیں ایرانی سفارت خانے کے ایک مسلمان سے شادی کی۔ اور شوہر کے ناگاہ انتقال کے بعد بنگال واپس آکر کلکتے میں مقیم ہو گئیں۔

طاہرہ دیوی، اردو رسالوں کے دوسرے مدیروں کے ساتھ ساتھ نگار کے مدیر نیاز فتح پوری سے بھی رسم مراسلت رکھتی تھیں نیاز صاحب کلکتے جاتے ہی رہتے تھے چنانچہ ایک بار کلکتے کے قیام میں انھوں نے طاہرہ دیوی سے بھی ملنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی خصوصی انداز سے نہیں بلکہ صرف اس انداز سے کہ جب ایک رسالے کا مدیر کسی دوسری جگہ جاتا ہے تو اپنے پرچے کے ہمدردوں اور لکھنے والوں سے بھی ملنے کی کوشش کرتا ہے۔

نیاز صاحب نے قمر زمانی بیگم کی داستان سناتے ہوئے، طاہرہ دیوی کا قصہ بھی مجھے سنایا تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ عارف نیازی نے نیاز صاحب سے استفسار کیے بغیر عبدالودود صاحب کو ایسا غلط جواب کیوں لکھ دیا۔ نیاز صاحب گھریلو زندگی میں اپنے بچوں سے محض قاعدے قرینے کی باتیں کرتے تھے، علمی و ادبی بحثیں چھیڑنا یا قمر زمانی بیگم و طاہرہ دیوی کے طرز کے قصے سنانا ان کے سامنے کبھی پسند نہ کرتے تھے یہی وجہ کہ ان کے خاندان کے اکثر افراد قمر زمانی بیگم کے قصے سے بھی پوری طرح واقف نہ تھے۔ اس قصے کا صحیح علم انھیں اس وقت ہوا جب نیاز صاحب کے بعد قمر زمانی بیگم کے سلسلے میں مجنوں گورکھپوری، مالک رام اور میرے مضامین شایع ہوئے۔ ایسی صورت میں عارف نیازی کا اصل واقعہ سے بے خبر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ادھر ادھر سے جو کان میں باتیں پڑی تھیں وہ انھوں نے نیاز صاحب کو یا مجھے خط دکھائے بغیر ودود صاحب کو لکھ دیں اگر ودود صاحب کا خط نیاز صاحب کی یا میری نظر سے گذرتا تو اس استفسار کی نوبت نہ آتی اور آج جو مغالطے طاہرہ دیوی شیرازی کے سلسلے میں پیدا ہو رہے ہیں وہ اس وقت دور ہو جاتے۔ افسوس کہ یہ قصہ ان کی حیات میں نہ نمٹ سکا اور اب لوگوں کو موقع ہے اس قصے کو جس طرح چاہیں توڑ مروڑ کر بیان کریں اس لیے کہ تردید کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

(فرمان فتح پوری)

کیا لفظ "معرکۃ الآرا" صحیح ہے؟

لفظ "معرکۃ الآرا" اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی تحریروں میں مل جاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ اردو میں یہ لفظ اپنے مفہوم کے لحاظ سے قطعی غلط ہے "معرکہ" عربی لفظ ہے اور اس کے معنی "میدان جنگ" کے ہیں (بعض لوگ اسے رے کے زیر سے پڑھتے ہیں یہ غلط ہے) "آرا" بھی عربی ہے اور "رائے" کی جمع ہے۔ اس طرح سے "معرکۃ الآرا" کا مفہوم ہوگا "آرا یعنی مختلف قسم کے تصورات و خیالات کا میدان جنگ" اس صورت میں یہ مرکب اضافی ہوگا۔ یہ ترکیب تو صحیح ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہم اردو میں اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال نہیں کرتے۔ جس مفہوم میں اردو میں ہم اسے استعمال کرتے ہیں اسے عظیم الشان، اہم، وقیع وغیرہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ "معرکۃ الآرا" کے بجائے "معرکہ آرا" ہوگا جس میں "آرا" "رائے" کی جمع کے طور پر عربی زبان کے لفظ کی حیثیت سے نہیں فارسی کے اسم فاعل کی حیثیت سے استعمال ہوگا جو "آراستن" سے مشتق ہے۔ "معرکہ آرا" اسم فاعل ترکیبی ہوگا اور اس کا مفہوم ہوگا "زینت دہ معرکہ یا زینت دہ میدان جنگ" یعنی وہ جس کے دم سے میدان کی رونق ہو۔ ایسی کتنی ہی ترکیبیں اردو میں مستعمل ہیں مثلاً انجمن آرا، گیتی آرا وغیرہ اقبال نے بھی کہا ہے ؎

"تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں" اور یہ اس لفظ کا صحیح استعمال ہے یہ ترکیب جیسا کہ ظاہر ہے فارسی ترکیب ہے۔ نیز چونکہ "آرا" خالص فارسی لفظ ہے اس لیے اس پر "ال" داخل کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ بیشک "معرکۃ الآرا" غلط العام ہے اور اس لیے صحیح "ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ جب یہ لفظ صحیح صورت میں مروج مفہوم کے لیے بولا جا سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اسے غلط شکل میں استعمال کیا جائے۔

(انجمن آرا، انجم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مذہبی تعلیم گاہیں نہ رہیں گی۔ طریقۂ تعلیم یکساں ہوگا

پٹنہ۔ یہاں مقامی گاندھی میدان میں ایک عام جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے سنگھت سوشلسٹ پارٹی کے رہنما ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کہا کہ میں اردو ہندی کو ایک ہی زبان سمجھتا ہوں اور بیس برس کے اندر دونوں زبان ایک ہو جائیں گی۔

انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو چاہئے کہ وہ پہلے انگریزی کو ختم کرنے میں مدد دیں پھر بعد میں اردو کی بات کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ طریقۂ تعلیم میں یکسانیت کی کوشش ہماری حکومت کرے گی (ہند اور پٹنہ)

انجمن ترقی اردو شاخ انبالہ کے زیر اہتمام یوم غالب

انجمن ترقی اردو شاخ انبالہ چھاؤنی کے زیر اہتمام مقامی بنارسی داس ہائی اسکول میں یوم غالب منایا گیا۔

سب سے پہلے انجمن کی مقامی شاخ کے صدر جناب صابر ابوہری صاحب نے ایک مختصر افتتاحیہ تقریر فرمائی جس میں انھوں نے غالب کی شاعری کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر خاص طور سے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد انجمن کے مقامی سکریٹری جناب ک۔ ب۔ پرواز ایم۔ اے نے غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں نیز غالب کی شخصیت پر ایک مقالہ پڑھا۔ بعد ازاں موسیقار جناب چمن لعل پوری نے غالب کی ایک غزل ترنم کے ساتھ سنائی۔ اس کے بعد ایک مختصر محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں صابر ابوہری۔ ک۔ ب۔ پرواز۔ حکیم علی احمد فکر اور جناب رام کشن تشنہ نے اپنا اپنا کلام پڑھا۔

اس پروگرام میں شہر کے متعدد اصحاب کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ سامعین نے اول سے آخر تک تمام پروگرام کو بڑی دلچسپی سے سنا اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

(سکریٹری)

اردو کے مسئلہ پر جن سنگھ اپنی پالیسی بدلنے کو تیار نہیں

پٹنہ۔ ایسی خبریں مشہور ہو رہی ہیں کہ زبان کے مسئلہ پر جن سنگھ اپنی پالیسی بدل رہا ہے لیکن متحدہ اپوزیشن پارٹی میں شامل ہونے کے باوجود جن سنگھ نے اس بات کو قبول نہیں کیا ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے جن سنگھ اردو کی جو مخالفت کرتا رہا ہے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے اردو کو جب دلی میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا جن سنگھ کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی تھی۔

(الجمعیۃ دہلی)

ادبی تحقیق کے باب میں اردو فارسی سے بڑھ گیا ہے

شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں ڈاکٹر نذیر احمد کی آمد

حال میں شعبۂ اردو جموں کشمیر یونیورسٹی میں ہوئی نیز اور پروفیسر حبیب اللہ در سروری صدر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر جموں کے شعبۂ اردو میں تشریف لائے۔

سروری صاحب کی صدارت میں ڈاکٹر نذیر احمد نے طلبہ کو خطاب کیا۔ ڈاکٹر گیان چند نے مہمان پروفیسروں کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اردو زبان میں فارسی اور عربی ادبیات نیز اسلامیات پر کئے ہوئے کاموں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اردو میں فارسی ادبیات بالخصوص فرہنگ نویسی پر جو کام ہوا ہے وہ فارسی میں بھی نہیں ہوا۔ ادبی تحقیق کے باب میں اردو فارسی سے بڑھ گیا ہے۔ اچھی بات چیت کے دوران فاضل مقرر نے ترتیب متن کی مشکلات پر بھی روشنی ڈالی۔ آخر میں طلبہ نے آپ سے چند سوالات کئے۔ مہمانوں کے شکریے پر نشست ختم ہوئی۔

(سکریٹری شعبۂ اردو)

انجمن ترقی اردو پنجاب کا سرکلر

ممبران اینڈ ہاک کمیٹی ضلع آرگنائزروں اور کارکنان انجمن کے نام

۲۲ فروری۔ ملک میں چوتھے عام انتخابات کی مصروفیات اب ختم ہو چکی ہیں۔ اس لیے ایک بار پھر انجمن کے کام کی جانب آپ کی توجہ دلائی جا رہی ہے۔ تاکہ آپ جو کچھ دنوں کے لیے انتخابات کی ہنگامی سرگرمیوں میں کھو گئے تھے۔ سابقہ جوش اور جذبات کے ساتھ دوبارہ اپنی انجمن کے کاموں کی طرف دھیان دیں۔

جس طرح آپ کو معلوم ہے۔ عام انتخابات کے پیش نظر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنے ایک سرکلر کے ذریعے انجمن کی ریاستی شاخوں کے انتخابات مارچ ۱۹۶۷ء کے آخر تک ملتوی کر دئے تھے اس فیصلہ سے ابتدائی رکنیت سازی کی میعاد ۳۱ مارچ تک بڑھ گئی تھی۔

اب آپ کی خدمت میں تاکیداً گذارش ہے۔ کہ رکنیت سازی کی رفتار کو تیز تر کر کے ہر جگہ ۳۱ مارچ تک رکنیت سازی کا کام مکمل کر لیں۔ اور جہاں جہاں ممکن ہو سکے۔ وہاں مقامی شاخوں کے انتخابات کر لیے جائیں۔

مقامی شاخوں کے عہدیداروں کا انتخاب کرنے کے لیے کم از کم دس روز قبل ریاستی دفتر کو مطلع ضرور فرمائیں تاکہ کسی ممبر اینڈ ہاک کمیٹی یا ضلع آرگنائزر کو انتخاب کی نگرانی پر مامور کیا جا سکے۔

سورج تنویر جنرل سکریٹری
ریاستی دفتر
۱۲۹۱ سکٹر ۲۱ بی چنڈی گڑھ

مدھیہ پردیش ہائر سکنڈری امتحان میں اردو کے طلبا کی پریشانی

بھوپال۔ مدھیہ پردیش ہائر سکنڈری بورڈ کے امتحانات شروع ہوگئے ہیں۔ امتحان کا جو پروگرام مرتب کیا گیا ہے اس میں اردو مضمون لینے والے امیدواروں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے جس پر اردو حلقوں میں سخت افسوس اور غم و غصہ کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ امتحانات کے پہلے اور دوسرے دن ہندی مضمون کا ایک ایک پرچہ رکھا گیا ہے۔ جب کہ اردو کے امتحان کے دنوں میں دو دو پرچے رکھے گئے ہیں۔ پہلا پرچہ انگریزی کا اور دوسرا پرچہ اردو رکھا گیا ہے اس طرح دوسرے دن بھی انگریزی کے ساتھ اردو کے پرچے رکھے گئے ہیں جس کی وجہ سے اردو لینے والے طلبہ کی پریشانی بڑھ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بورڈ کے منتظمین کو اردو، انگریزی کے مضامین کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں ہے ان کے نزدیک صرف ہندی ہی کے پرچے اہمیت رکھتے ہیں یاد رہے کہ اس سے قبل بورڈ نے اردو اور مراٹھی والوں کے لیے اردو اور مراٹھی میں پرچے فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ریاستی انجمن ترقی اردو کی تحریک اخبارات کے احتجاج اور جبل پور ہائی کورٹ کے فیصلہ پر بورڈ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا تھا۔

(افکار بھوپال)

ہندوستانی کلچر کا ارتقا تاریخ کے آئینہ میں

ماہانہ نظام اردو لکچر کا دوسرا جلسہ جمعہ ۳ر مارچ ۶۷ء کو دہلی یونیورسٹی میں شروع ہوا۔ جناب ڈاکٹر سی ڈی دیش مکھ صاحب نے صدارت فرمائی۔ جلسہ کا آغاز مرحوم ہز اگزالٹڈ میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم والی حیدرآباد دکن کے انتقال پر ملال پر اظہار تعزیت سے ہوا۔

جناب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے معزز و ممتاز مقرر ڈاکٹر تارا چند صاحب کا تعارف کرایا اور اس کے بعد مختصر طور سے شعبہ اردو کی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جناب ڈاکٹر بی۔ این گنگولی وائس چانسلر نے مہمان محترم کو خوش آمدید کہا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے شعبہ اردو کی ان مخلصانہ مساعی کو بھی سراہا جو اس شعبہ نے علم و فن کی ترقی کے سلسلہ میں عموماً اور یونیورسٹی کے لیے خصوصاً انجام دی ہیں ڈاکٹر سی ڈی دیش مکھ صاحب نے علم و ادب کے متعلق ڈاکٹر تارا چند صاحب کی خدمات جلیلہ کو خراج عقیدت پیش کیا اور اس جلسہ میں شرکت کے لیے اظہار مسرت فرمایا۔

اس کے بعد جناب ڈاکٹر تارا چند صاحب نے "ہندوستانی کلچر کا ارتقا۔ تاریخ کے آئینہ میں" کے عنوان کے اپنے بصیرت افروز خطبے کا پہلا حصہ پڑھا۔ یہ حصہ تاریخ ہند کے دور قدیم پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ہندوستانی فلسفیوں مہاتماؤں مدبرین حکمت فضلا اور فن کاروں کے کمالات کا نیز انھوں نے ہندوستانی سماج کے ارتقاء کے سلسلے میں ان کے کارناموں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اس شاندار عہد کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی۔ تقریر کے دوسرے حصہ میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے ان اثرات کا جائزہ پیش کیا جو اسلام اور مسلمانوں نے ہندوستانی تہذیب پر ڈالے ہیں اور ان عوامل پر روشنی ڈالی جنھوں نے ان ثقافتی دھاروں کے امتزاج سے ایک واحد ثقافتی یکجہتی کی شکل اختیار کرلی جس کے مختلف اجزا آپس میں مل جل گئے ہیں انھوں نے ان تقاضوں کا بھی تفصیلی طور سے ذکر کیا جن کا ہندوستانی سماج سے مغرب اور اس کے ہمہ جہت اثرات مطالبہ کر رہے ہیں۔ آخر میں جناب ڈاکٹر سی۔ ڈی دیش مکھ صاحب نے فرمایا کہ ہندوستانی تہذیب ہر عہد میں گل ہائے رنگا رنگ کے مختلف تہذیبی قدروں کے نقش و نگار پیش کرتی ہے عہد قدیم انسانی سلسلۂ فکر کا نقطہ آغاز ہے اور عہد وسطی میں اسلامی تہذیب کے نقوش فکر و عمل کے ہر شعبہ پر پھیلے ہوئے ہیں

تمام مذاہب عالم میں اسلام دنیا میں صحیح جمہوریت کا نمونہ پیش کرتا ہے اس تہذیبی ورثہ نے ہندوستان کی سماجی تفریق کو ختم کیا پس ماندہ انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی اور انھیں عناصر سے ہماری تہذیب بنتی ہے اور سنورتی ہے اور بقول ڈاکٹر تاراچند اس مشترک تہذیبی عناصر سے بین الاقوامی انسانوں کی نمود ہوگی۔

خطبے کے اختتام پر جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے مہمان محترم ڈاکٹر تاراچند، جناب ڈاکٹر سی۔ڈی دیش مکھ، جناب وائس چانسلر اور دیگر معزز حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(سید ظہیر الحسن۔ سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی-۷)

اردو مدھیہ پردیش میں ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کی جائے

۲۶ر مارچ کو انجمن ترقی اردو کی دعوت پر دفتر بزم اہل ادب توپ خانہ اوجین میں بزم ادب، بزم اہل ادب اور انجمن ترقی اردو کا جلسہ ہوا۔ اردو کے مسائل پر گفتگو ہوئی اور حالیہ چناؤ میں جن جماعتوں کی طرف سے تعاون ملا۔ ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

اردو کے متعلق یہ اتفاق رائے قرار پایا کہ حکومت مدھیہ پردیش اردو کو صوبے میں ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرے کیونکہ مدھیہ پردیش میں سابق ریاست بھوپال جاورہ کوروائی شامل ہیں جہاں پر دفتری زبان اردو تھی اور دوسرے اضلاع میں جہاں اردو لکھی پڑھی اور بولی جاتی ہے پورے صوبے میں ہندی کے بعد اردو ہی ثانوی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

سہ لسانی فارمولے جو حکومتوں نے منظور کئے ہیں اس میں اردو کی پڑھائی کا معقول انتظام ہو۔ مدھیہ پردیش کی چھ یونیورسٹیوں وکرم اوجین، اندور، رائے پور، ساگر، جبل پور، گوالیار میں ایم اے پی ایچ ڈی تک کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے۔

اردو مڈل اسکول اوجین کو ہائر سکنڈری اور بہرایچ اردو اسکول کو مڈل اسکول بنایا جائے مدھیہ پردیش کے ریڈیو اسٹیشن اندور بھوپال، رائے پور، جبل پور، گوالیار میں روزانہ باقاعدہ اردو نشریات کا انتظام کیا جائے۔ میونسپل کارپوریشن میں اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں اور جوابات اردو میں دئے جائیں اور نقشے اردو میں بھی شایع کی جائیں۔

حکومت جلد از جلد اردو والوں کے مطالبات منظور فرماکر شکریہ کا موقع عطا فرمائے۔ طے پایا کہ ان تجاویز کی نقول جماعتوں اور اخبارات کو بھیجی جائیں۔ (اے۔ ایم۔ شمیم سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ اوجین)

جبلپور یونیورسٹی میں مشاعرہ

بزم ادبیات اردو و فارسی جبلپور یونیورسٹی جبلپور کے زیر اہتمام مہاکوشل آرٹس کالج جبلپور کے آڈیٹوریم میں ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں جناب پروفیسر منشا الرحمن خاں منشا، جناب راز الہ آبادی، جناب مولانا سعید اعجاز کامٹوی وغیرہ نے شرکت کی مقامی شاعروں میں پروفیسر اختر نقلی، جناب عبد الحی انجم اور جناب صابر جبلپوری وغیرہ خصوصیت کے ساتھ پسند کئے گئے۔ مشاعرہ شام چار بجے سے ساڑھے سات بجے تک نہایت حسن خوبی کے جاری رہا۔ مشاعرہ کی صدارت جناب جے کشن چودھری حبیب نے فرمائی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب کنجی لال دوبے ایم۔ ایل۔ اے نے جلسہ کی رونق کو دوبالا کیا۔ جبلپور یونیورسٹی کی بزم ادبیات اردو و فارسی نے اپنی سابقہ روایات میں اس مشاعرہ کے ذریعہ ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

(متین احمد صدر بزم ادبیات اردو فارسی جبلپور یونیورسٹی جبلپور)

مہاراشٹر میں اردو اسکول کا جشن سیمیں

مہاراشٹر کے ضلع رتناگیری میں نیشنل ہائی اسکول داپولی اردو ذریعۂ تعلیم کا سب سے پہلا ثانوی مدرسہ ہے اس کا قیام جون ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا۔ اس اسکول کا جشن سیمیں جو بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر ملتوی ہو رہا تھا گذشتہ ۲۱ر فروری کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ (بی۔ ڈی پرکار پرنسپل)

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شمشیر و سناں (رزمیہ نظموں کا انتخاب)

مرتب:۔ ساحر لکھنوی
ناشر:۔ انجمن ترقی اردو لکھنؤ
صفحات:۔ ۱۲۸
قیمت:۔ دو روپے

جمال صابر کلیری۔

مرتب:۔ وحید اختر مسعود
ملنے کا پتہ:۔ نظامی بک ایجنسی۔ بداؤں
صفحات:۔ ۴۳
قیمت:۔ ایک روپے

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ و پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا